مولانا محمد حنیف ندوی

محتویاتِ قرآن

(۲)

علم المخاصمہ

قرآنِ حکیم نے چار مشہور گروہوں کے عقائد و افکار اور عادات و نفسیات سے تعرض کیا اور بتایا کہ تم میں کن کن گمراہیوں نے جنم لیا اور کہاں کہاں تمہارے قدم صراطِ مستقیم سے ہٹے اور بھٹکے اور پھر یہ کہ تمہارے ان مزعومات کے مقابلہ میں صحیح موقف کیا ہے۔ یہ چار گروہ یہ ہیں۔ یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافق ـــــ مشرکین ہی میں کچھ ایسے انتہا پسند لوگ بھی تھے۔ جو سرے سے مذہب کے اس بنیادی عقیدہ ہی سے منحرف ہو گئے تھے کہ زندگی اور موت کے اختیارات اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور یہ کہ اس عارضی اور فانی زندگی کے بعد ایک اور مستقل اور پائیدار زندگی کا بھی وجود ہے۔

وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یھلکنا الا الدھر[1]

اور کہتے ہیں کہ ہماری زندگی کا تعلق تو بس دنیا ہی تک محدود ہے۔ موت اور زندگی کا یہی میدان ہے۔ یہیں ہم موت اور زندگی سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور موت کا سبب خدا نہیں دہر اور زمانہ ہے۔

دہریا دہریت کا یہ جدید ترین تصور کسی مستقل بالذات فلسفیانہ فکر پر مبنی نہ تھا یہ مشرکینِ مکہ کی محض پریشان خیالی اور تضاد کا کرشمہ تھا۔ اس کے بارہ میں کوئی یقینی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے اس دور کے عقائد و افکار سے متعلق قرآن حکیم کے علاوہ اور کوئی ایسا مستند ماخذ پایا نہیں جاتا۔ جس سے اس باب میں استفادہ کیا جاسکے۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے اس مسئلہ پر اس سے زیادہ روشنی نہیں پڑتی کہ آخرت اور زندگی و موت کے متعلق عربوں میں ایک

---

[1] الجاثیہ ۲۴

نقطۂ نظر یہ بھی رائج تھا کہ زندگی دنیا ہی کے مہیا کردہ اسباب و علل سے ابھرتی ہے۔ اور انھیں اسباب و علل کی بنا پر آخر کار ختم ہو جاتی ہے۔ محاسبہ یا جزا اور سزا کا قصہ، محض گھڑنت اور افسانہ ہے:

ان ھذا الا اساطیر الاولین [۲]

یہ سب اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

قرآن حکیم نے اس موقف کے جواب میں مخاصمہ کی کیا شکل اختیار کی اس کا ذکر ہم مشرکین مکہ کے عقائد و افکار کے ضمن میں تفصیل سے کریں گے۔

یہودی

یہودی دنیا کی قدیم ترین قوم ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد بار اس کا ذکر آیا ہے۔

وقالت الیھود لیست النصاریٰ علیٰ شیٔ [۳]

اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا کوئی دین نہیں۔

ولن ترضیٰ عنک الیھود ولا النصاریٰ حتیٰ تتبع ملتھم [۴]

اور آپ سے نہ یہودی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی، یہاں تک کہ آپ ان کی ملت کی پیروی اختیار کریں۔

وقالت الیھود والنصاریٰ نحن ابناء اللہ واحباءہ [۵]

اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں ہم اللہ کے بیٹے اور پیارے ہیں۔

یہودی کا انتساب دراصل "یہوذا" کی طرف ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا چوتھا معزز فرد شمار ہوتا تھا۔ یہ جب تک زندہ رہا بنی اسرائیل کا سربراہ رہا۔ اس کی وفات کے بعد اقتدار اس کی اولاد میں منتقل ہو گیا ـــــ حضرت موسیٰ کے زمانے میں یہودی چار شاخوں میں انقسام پذیر ہو گئے۔ لیکن دینی سربراہی کا اعزاز اسی شاخ کو حاصل رہا جس کا نسبی تعلق "یہوذا" سے تھا۔ بخت نصر نے جب انھیں قدس سے نکالا اور انھوں نے بابل میں رہنا شروع کیا تو یہودیت کا اطلاق بنی اسرائیل کی تمام شاخوں پر ہونے لگا۔

---

۲ المومنون: ۸۲ ۳ البقرہ: ۱۱۳ ۴ البقرہ: ۱۲۰ ۵ المائدہ: ۱۸

بنی اسرائیل اور یہودیت کے اطلاق میں ایک باریک فرق ہے۔ یہودی اس شخص کو کہتے ہیں جس نے یہودی مذہب کو اور یہودی روایات کو اپنا لیا ہو۔ چاہے اس کا نسبی تعلق بنی اسرائیل سے نہ ہو۔ اور بنی اسرائیل سے مراد وہ بارہ اسباط اور ان کی اولادیں ہیں جن کا نسلی تعلق حضرت یعقوب سے ہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کا ذکر دونوں معنوں میں کیا ہے، نسلی معنوں میں بھی اور دینی معنوں میں بھی۔

ولقد آتینا موسیٰ الھدیٰ واورثنا بنی اسرائیل الکتٰب [۵۶]

اور ہم نے موسیٰ کو (کتاب) ہدایت دی۔ اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث ٹھہرایا۔

ان ھذا القرآن یقص علیٰ بنی اسرائیل اکثر الذی ھم فیہ مختلفون [۵۷]

بلاشبہ یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے ان بہت سی باتوں کو بیان کر دیتا ہے جن میں کہ خود ان میں اختلاف رونما ہے۔

یہودیوں کے لیے یہودی ادب اور صحائف میں ایک لفظ عبرانیوں کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ جو قریب قریب بنی اسرائیل ہی کا مترادف ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ عبرانیوں سے مراد دراصل وہ لوگ تھے جنھوں نے یہودی تہذیب و ثقافت کو پوری طرح اختیار کر لیا تھا۔ اور یونانی زبان و ادب کا اثر ان پر کم پڑا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ یہودیت کا تعلق دین اور مذہبی نظریہ سے ہے، بنی اسرائیل کا نسل اور مذہب سے اور عبرانیوں کا مذہب کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت سے بھی۔ آخر آخر میں لفظ یہودی کا ایسا چلن ہوا کہ بغیر کسی امتیاز کے پوری قوم پر اسی کا اطلاق ہونے لگا۔

یہ تو قریب قریب طے ہے کہ یہودیوں کے کئی قبائل جب آرب کا بند ٹوٹا تو یمن سے ہجرت کر کے مدینہ کے آس پاس آ کر بس گئے۔ لیکن یمن میں یہ لوگ کب آئے اور کن اسباب و عوامل سے مجبور ہو کر انھیں ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کا جواب کم از کم یہودی نوشتوں میں پایا نہیں جاتا۔ اس سوال پر زیادہ تر روشنی یا تو اسلامی ماخذ تاریخ یا روایات نے ڈالی اور

---

[۵۶] المؤمن : ۵۳ [۵۷] النمل : ۷۶

یا پھر دوسرے غیر یہودی مآخذ نے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ قبائل جب فلسطین سے نکلے تو یہودیت سے ان کا تہذیبی اور ثقافتی رشتہ بتدریج کمزور پڑتا چلا گیا اور نوبت بایں جا رسید کہ پڑھے لکھے یہودی انھیں بھول گئے۔ یہ بھی ممکن ہے، ان قبائل نے کسی حد تک آہستہ آہستہ مقامی اثرات کو قبول کر لیا ہو۔ اور اس بنا پر یہودیت کے ثقہ حلقوں میں انھیں سرے سے یہودی ہی نہ سمجھا جاتا ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں یہودی عصبیت حقیقتاً ختم ہو گئی تھی، یا یہ کہ یہودی قومیت کے تنگ نظرانہ تصور سے یہ دست بردار ہو گئے تھے۔ اور یہ کہ ان کے اپنے حلقوں میں تعلیم و تربیت کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ قدس کو چھوڑ کر یہ کیوں اور کب یمن میں آباد ہوئے۔ اس کا جواب مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے دیا ہے۔ اولیری (OLEARY) کا کہنا ہے کہ یہودی قبائل کی ہجرت کا یہ واقعہ ۷۰ء اور ۱۳۲ء کے اس درمیانی عرصہ میں رونما ہوا جب ہیکل تباہ ہوا اور ہڈریان (HADRIAN) نے یہودیوں پر اس قدر ظلم و ستم ڈھایا کہ ان کے لیے قدس یا فلسطین میں رہنا دشوار ہو گیا۔[۵۸]

اولیری کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بلاشبہ ان کی ہجرت کا بڑا سبب رومیوں کے حملے اور اس کے نتیجے میں ابھرنے والی پریشانیاں تھیں۔

مدینہ کے گرد و نواح میں جو قبائل آباد ہوئے ان میں بنو قریضہ، بنو بہدل، بنو عکرمہ اور بنی نضیر وغیرہ کا نام سیر و تاریخ کی کتابوں میں اکثر آتا ہے۔ یہ بستیاں جو یثرب کے گرد و نواح میں یہودیوں نے قائم کیں۔ صرف بستیاں یا نو آبادیاں ہی نہیں تھیں، ان کے تہذیبی و دفاعی مرکز بھی تھے۔ یہاں ان کے باقاعدہ قلعے تھے، جیسے ناعم، قموص، حصن ابی الحقیق، حصن الشق، النطاۃ اور سلالم وغیرہ۔ تعلیمی اغراض کے لیے انھوں نے تمام یہودی بستیوں میں اپنے مخصوص مدارس کا جال بچھا رکھا تھا، جنھیں یہ اپنی اصطلاح میں مدراش کہتے، یہاں تعلیم و تدریس کا اہتمام بھی ہوتا اور ایسے اجتماعات بھی ہوتے جن میں ان کی ہفتہ وار یا گاہے بگاہے منعقد ہونے والی مخصوص تقریبات ادا کی جاتیں۔

---

۵۸ تاریخ العرب قبل الاسلام ڈاکٹر جواد علی ج ۶، ص ۱۸

کھیتی باڑی، تجارت اور صنعت و حرفت کی مختلف شاخوں پر ان کا قبضہ تھا۔ زیادہ تر سودی کاروبار کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے عرب انھیں نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان میں علیحدگی انزوا اور قومی تعصب کا رجحان اگرچہ شروع ہی سے موجود تھا اور یہی تعصب ان کی قومی زندگی کا جزو لاینفک رہا۔ تاہم انھوں نے کوشش کی کہ جس قوم میں انھیں رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے ان سے اجتماعی اور ادبی رشتوں کو استوار کرنا ضروری ہے۔ اس بنا پر ایک طرف تو انھوں نے عربوں سے مصاہرت قائم کی اور دوسری طرف عربی زبان سیکھی۔ اور اس میں اس درجہ مہارت حاصل کی کہ اس دَور کی ادبی و شعری نشاط آفرینیوں میں ان کا بھی چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ السموءل بن عادیا، کعب بن الاشرف، ابوالزناد اور شریح بن عمران وغیرہ ایسے شعرا ہیں جن کا ادب رولیات کی کتابوں میں یہودی شعرا کی حیثیت سے نام آتا ہے۔

یہودیوں میں کیا روحانی و اخلاقی امراض پائے جاتے تھے اور فکر و نظر کی کس کس کجی اور گمراہی نے ان کو بگاڑ رکھا تھا۔ قرآن حکیم نے اصولی طور پر ان سب چیزوں کی نشاندہی کی ہے ہم ان امراض کو مندرجہ ذیل پانچ خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ پندار و غرور

۲۔ حد سے بڑھی ہوئی بداخلاقی

۳۔ تحریف

۴۔ کتمان حق اور

۵۔ الفاظ پرستی یا حرفیت پرستی میں غلو۔

قومیں جب اپنی اصل تہذیبی روح کو بھول جاتی ہیں اور اس پیغام و دعوت کو فراموش کر دیتی ہیں جس نے ان کی تعمیر اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہو تو پھر کہنے کے لیے ان کے پاس سوا اس کے اور کوئی چیز نہیں رہتی کہ۔ ہم چو ما دیگرے نیست۔ یہودی بھی اپنے دورِ انحطاط میں اسی پندار اور غرور کے بل پر زندہ تھے کہ ہم لاکھ گناہ گار سہی، خطاکار اور بدکار سہی۔ ہمارا رشتہ اور تعلق تو بہرحال اس عظیم قوم میں سے ہے جس پر توراۃ، زبور اور مزامیر ایسی کتابیں نازل ہوئیں جنھوں نے دنیا میں قانون، شریعت اور حکمت و دانش کا اول اول درس دیا۔ چنانچہ خود آنحضرتؐ

کے زمانہ میں برملا یہ اس افتخار کا ذکر کرتے تھے۔

نحن ابناء الله و احباءہٗ [۹]

ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

اس لیے اگر ہمیں سزا بھی ملی تو چند دن کے لیے ملے گی اس کے بعد پھر چین اور ٹھاٹھ کی زندگی ہے

وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ۔ [۱۰]

اور کہتے ہیں دوزخ کی آگ ہمیں چند دن ہی جلا پائے گی۔

غرور و پندار ایک غلط اور غیر صحت مند جذبہ ہے اور جو شخص یا قوم بھی اس میں مبتلا ہوتی ہے اس کو اس سے دو نقصان پہنچتے ہیں۔ ایک تو اسے کمزوریوں اور غلطیوں کا احساس نہیں ہو پاتا۔ دوسرے اس کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ یہ دوسروں کی خوبیوں کو اپنا سکے۔ یہی المیہ یہودیوں کو پیش آیا انھوں نے تاریخ کے کسی دَور میں بھی اصلاح کی ضرورتوں کو محسوس نہیں کیا۔ اور نہ دوسری قوموں سے کوئی سبق ہی حاصل کیا۔ اور یہ تعصب، یہ علیحدگی کا جذبہ اور تنگ نظری اور تنگ خیالی اسی وجہ سے ان میں پیدا ہوئی کہ ان کو دوسری قوموں میں گھل مل کر رہنے کا سلیقہ ہی نہیں آیا۔

قرآنِ حکیم نے اس غرور و پندار کے جواب میں بطور مخاصمہ کے دو باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ اگر تم واقعی اللہ کے چہیتے اور پیارے ہو تو پھر تمھیں تمھاری بداعمالیوں کی وجہ سے مسلسل اجنبی قوموں کے ظلم و استبداد کا ہدف کیوں ٹھہرایا گیا ہے۔

قل فلم یعذبکم بذنوبکم بل انتم بشر ممن خلق یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء ولله ملک السموٰت والارض وما بینہما والیہ المصیر [۱۱]

کہہ دیجیے کہ پھر وہ تمھاری بداعمالیوں کے سبب تمھیں عذاب کیوں دیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم اس کی مخلوقات میں دوسروں کی طرح انسان ہو، وہ جسے چاہیے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے۔ اور آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے سب پر خدا ہی کی حکومت ہے اور سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

---

[۹] المائدہ : ۱۸ [۱۰] البقرہ : ۸۰ [۱۱] المائدہ : ۱۸

یہود کی پوری مذہبی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ قوم کسی دور میں بھی امن و سکون کے ساتھ نہیں رہ سکی۔ اس کو ہمیشہ اس درجہ آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا اور اپنے وطن سے نکل کر تکالیف و شدائد کو برداشت کرنا پڑا کہ خود ان کی اس حالت سے متاثر ہو کر ان کے نبیوں نے نوحے لکھے اور اس کے لیے خود انہی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔

قرآنِ حکیم نے اس آیت میں ان کی اسی کمزور رگ کو چھیڑا ہے اور پوچھا کہ تاریخ کو سامنے رکھ کر یہ بتاؤ کہ تمہارا یہ ادعا اور تفاخر کہاں تک حق بجانب ہے۔

دوسری بات اس غلط فہمی کے جواب میں ہے کہ چونکہ ہم اللہ کے پیارے اور بیٹے ہیں اس لیے جہنم کی آگ ہمیں چند روز کے سوا چھونے کی جرأت نہیں کرے گی اور اس کے بعد ہمیں ابدی نجات اور فلاح و کامرانی کی لذتوں کا سزاوار سمجھا جائے گا۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا استفسار ہے:

قل اتخذتم عند اللہ عهدا فلن يخلف اللہ عهده ام تقولون على اللہ ما لا تعلمون ۝ بلى من كسب سيئة و احاطت به خطيئته فاولئك اصحب النار هم فيها خلدون ۝[۱]

ان سے پوچھیے۔ کیا تم نے خدا سے اس نوع کا اقرار لے رکھا ہے جس کی وہ خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ یا یہ بات ہے کہ تم خدا کے بارے میں ایسے کلمات کہتے ہو جن کا تم کو مطلق علم نہیں۔ سن رکھو! جس نے بھی بُرے کام کیے اور گناہ نے ان کو گھیر لیا۔ ایسے لوگوں کو جہنم میں جانا ہوگا اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہوگا۔

یعنی ایسا ہونا اس وقت ممکن تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے قومی سطح پر اس طرح کی کوئی یقین دہانی کرائی ہوتی لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو تمھیں کیا حق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے ہمہ گیر قانون کو مجروح کرو۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی قوم کو اس درجہ چہیتا اور محبوب نہیں ٹھہرایا گیا ہے کہ ہر حالت میں وہ احتساب سے محفوظ اور گناہ و سرکشی اور معصیت کے بلا محابا ارتکاب کے باوجود سزا نہ پائے۔ ان نادانوں کو یہ نہیں معلوم کہ مکافاتِ عمل کا قانون اٹل ہے جس سے ہر شخص کو دوچار ہونا ہے اور اپنے کیے کی سزا پانا ہے۔

حد سے بڑھی ہوئی بداخلاقی

یہودیوں سے مخاصمہ کا ایک پہلو اُن کی بداخلاقی تھی۔ عرب اگرچہ عرصے سے شریعت و دین

---

[۱] المائدہ : ۸۰

کی برکات سے محروم چلے آ رہے تھے۔ تاہم ان میں برائیوں کے پہلو بہ پہلو خوبیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ ان کے معاشرہ میں وفا، مروت، شجاعت، علو نفسی، جود و سخا اور حمیت و غیرت کے پیمانوں کو خاص مقام حاصل تھا۔ یہ خوب جانتے تھے کہ کون عادات و شمائل ان کے جذبۂ تفاخر کو تقویت پہنچاتے ہیں اور کن مشاغل یا عادات سے ان کے جذبہ کو گزند پہنچتا ہے۔ یہودیوں کی بدنصیبی یہ تھی کہ بہ ظاہر تورات کو مانتے اور صحائف انبیا کے وارث و ترجمان سمجھے جاتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے دل ایمان کی روشنی سے تہی تھے۔ ان کی پرانی اور قدیم بیماری جس پر انھیں بار بار ڈانٹا گیا۔ مال و زر کی بے پناہ محبت تھی۔ ان کی عادت و خو کا یہ انداز تھا کہ ادنی درجے کی خواہشات کو اعلی مقاصد پر ترجیح دی جائے اور یہ جاننے کی کوشش نہ کی جائے کہ مادی اور عاجل قسم کے فوائد کے مقاصد میں روحانی اور قائم اور زندہ رہنے والی برکات کا کیا درجہ ہے۔

اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر[۱۳]

بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے عوض ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو۔

ایمان کی کمی اور حرص و زر کی شدت نے ان کی زندگی کو اخلاقی معیار اور دستور و آئین کی پاس داری اور پابندی سے بالکل آزاد کر دیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انھیں کسی بھی برائی کے ارتکاب سے باک نہ تھا۔ بشرطیکہ اس سے کوئی مالی و دنیوی منفعت وابستہ ہو۔ اور جب کوئی قوم پستی کی اس سطح پر آ رہے اور اس کے سامنے کوئی بندھا ٹکا نظامِ اخلاق یا ضابطۂ اخلاق نہ رہے تو پھر اس میں ایسی ایسی برائیاں بھی ابھر آتی ہیں جن سے بظاہر مالی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ نزولِ قرآن کے دوران ان کی اخلاقی حالت کیا تھی قرآن نے اس پر پوری طرح روشنی ڈالی ہے:

سمّٰعون للکذب اکّٰلون للسحت[۱۴]

اور جھوٹی باتیں بنانے کے لیے جاسوسی کرنے والے اور (سحت یا) حرام کھانے والے ہیں۔

"سحت" ہر اس برائی کو کہتے ہیں جس کے بروئے کار آنے سے معاشرہ کی تذلیل ہو۔ قومی

---

۱۳ البقرہ : ۶۱ ۱۴ المائدہ : ۴۲

پندار مجروح ہو۔ یا جو تقاضائے انسانیت اور مروت کے شایانِ شان نہ ہو۔ اس میں ربا، رشوت اور استحصال کے وہ تمام ہتھکنڈے داخل ہیں جو ناجائز اور حرام ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہودیوں کے اثر و نفوذ سے پہلے یہ برائیاں عربوں میں بالکل پائی نہیں جاتی تھیں۔ البتہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کی آمد سے ان برائیوں کو زیادہ تقویت ملی۔ کیونکہ ان برائیوں کے بارہ میں ان کا صاف صاف نظریۂ اخلاق یہ تھا کہ سرے سے ان کو برائیوں سے تعبیر کرنا ہی غلط ہے کیونکہ بدمعاملگی، ربا، رشوت اور دھوکہ اور فریب کا استعمال اس وقت برائی سمجھا جا سکتا ہے جب ان کا تعلق مہذب اہل کتاب سے ہو۔ رہے یہ "اُمی" یا وحی و تنزیل سے محروم غیر مہذب لوگ تو ان کے بارہ میں ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہونے کی۔

لیس علینا فی الامیین سبیل ۱۵

اُمیوں کے بارہ میں ہم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

یعنی اخلاق کے دو پیمانے ہیں۔ ایک اپنوں کے لیے اور ایک مخالفین کے لیے۔ قرآن حکیم نے اس کے جواب میں یہ حکیمانہ بات پیش کی کہ اخلاقیات کے بارہ میں اپنوں اور غیروں کی یہ تقسیم جائز نہیں۔ اس لیے کہ یہی وہ غلط فلسفۂ حیات ہے جس کے بل پر ہمیشہ بالادست اور شائستہ قوموں نے دوسروں کا استحصال کیا اور انھیں دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔

بلیٰ من اوفی بعھدہ واتقی فان اللہ یحب المتقین ۱۶

ہاں، جو بھی اپنے اقرار کا پاس کرے گا اور خدا سے ڈرے گا (اسے جان لینا چاہیے کہ اللہ (ایسے) ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔

اور پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جو قوم دوسروں کے لیے ہر طرح کی بددیانتی کو جائز تصور کرتی ہے وہ اپنے حلقوں میں ہمیشہ ایمان داری کے اصولوں کا خیال رکھے گی۔ انسانی فطرت کا یہ فیصلہ ہے کہ اخلاقیات کے معاملہ میں تفریق کا یہ انداز قطعی غلط اور غیر منطقی ہے۔ صحیح تقسیم یوں ہے کہ کوئی قوم یا ایمان دار ہے اور یا ایمان دار نہیں ہے۔ اگر ایمان دار ہے تو یہ

---

۱۵ آل عمران : ۷۵

۱۶ آل عمران : ۷۶

زندگی کے تمام خانوں میں ایمان داری کو اپنا نصب العین ٹھہرائے گی اور اگر بدقسمتی سے یہ ایمان داری کی نعمت سے محروم ہے تو پھر وہ اپنوں کو بھی اپنی بددیانتی کا شکار کرکے رہے گی۔

یہودیوں کی بداخلاقی کے متعلق مضمون نامکمل رہے گا اگر ہم اس حقیقت کا اظہار نہ کریں کہ دین کی حقیقی روح نے کبھی بھی ان کے قلب و ضمیر میں جگہ نہیں پائی۔ یہی وجہ ہے اپنی پوری تاریخ میں کسی دور میں بھی انھوں نے اس بات کا ثبوت مہیا نہیں کیا کہ ان کا اپنا کوئی ضابطۂ اخلاق ہے یا کچھ روحانی اور اخلاقی قدریں ہیں جن کا ان کو پاس اور لحاظ ہے۔ ہمیشہ احکام خداوندی کو انھوں نے ٹالا اور توڑا ہے اور ایسی ایسی تاویلات بے جا اور حیل ناروا سے کام لیا ہے جن سے دین کی غرض و غایت اور صورت ہی ختم اور فوت ہو جاتی ہے۔

سبت کے احترام کے پیش نظر ان سے کہا گیا کہ اس روز یہ کام کاج بند رکھیں اور خشوع و خضوع اور یکسوئی کے ساتھ اللہ کو یاد کریں۔ اپنی دینی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور اس بات کا جائزہ لیں کہ تورات کی رُو سے ان میں کیا کیا نقائص اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ دریا کے قرب و جوار میں رہنے والے یہودی اس دن کی اہمیت کو دل و جان سے تسلیم کرتے الٹا انھوں نے نافرمانی کی انوکھی تدبیر یہ اختیار کی کہ سبت سے پہلے رات ہی کو دریا کے کنارے اپنے جال بچھا دیتے تاکہ شکار بھی نہ کرنا پڑے اور مچھلیاں بھی ہاتھوں سے نہ جانے پائیں۔

دین کے بارہ میں حیلہ جوئی کی اس صورت کو قرآن حکیم نے اعتدا اور تجاوز قرار دیا ہے

ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت۔[۱۷]

اور تم ان لوگوں کو خوب جانتے ہو جنھوں نے ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کرنے میں حد سے تجاوز کیا۔

اس کے علاوہ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو کاروباری ہونے کے باوجود پرلے درجے کے بدعہد اور نادہند تھے۔ قرآن حکیم نے ان کی اس عادت کا بھی ذکر کیا ہے۔

ومنھم من ان تامنہ بدینار لا یؤدہ الیک الا مادمت علیہ قائما۔[۱۸]

---

[۱۷] البقرہ : ۶۵ [۱۸] آل عمران : ۷۵

اور ان میں کوئی اس طرح کا بھی ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو تو جب تک اس کے سر پر کھڑے نہ رہو یہ اسے دینے کا نہیں۔

تحریف

تورات میں تحریف کن معنوں میں ہوئی ہے۔ الفاظ و متون کی شکل میں یا ترجمہ و تشریح کی صورت میں۔ اس مسئلہ میں شروع ہی سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اگرچہ تحریف لفظی اور معنوی دونوں کا ذکر کیا ہے مگر ان کا اپنا رجحان اس طرف ہے کہ اللہ کی اس کتاب میں تغیر و تبدل اس وجہ سے ہوا ہے کہ چند برخود غلط علما اور احبار نے اس کی تشریح و تفسیر میں اپنے قومی تعصبات اور ذاتی کمزوریوں کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ یہ تورات کے احکام اور روح کے مطابق اپنی اصلاح کرتے الٹا اس دستور ہی کو انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ تمھارے اعمال و عقاید اور تورات کی تعلیمات میں تضاد رونما ہے۔ تحریف معنوی کی تائید میں حضرت شاہ صاحب نے حبرِ اُمت حضرت ابن عباس کا ایک قول نقل کیا ہے [19]

تورات یا بائبل کا درجہ استناد کیا ہے گزشتہ ابواب میں ہم اس مسئلہ پر تفصیل سے تعرض کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اب اس مسئلہ میں دو رائیں پائی نہیں جاتیں کہ موجودہ بائبل صرف اسی حد تک مستند ہے کہ اس سے یہودیوں کی فکری و عملی تاریخ کا سراغ ملتا ہے۔ کیونکہ جہاں تک متون و صحائف کا تعلق ہے ان میں اچھا خاصا تغیر و تبدل رونما ہے۔ خصوصاً جب سے علماءِ تحقیق نے اس کے متون کا لفظی و معنوی جائزہ لینا شروع کیا ہے اور تنقیداتِ عالیہ کی کسوٹیوں پر اسے اچھی طرح جانچا اور پرکھا ہے۔ اس کی حفاظت و استناد کے بارہ میں وہ روایتی عقیدہ قائم نہیں رہا جو اہل کتاب کے حلقوں میں صدیوں سے مقبول و مروج چلا آرہا تھا۔

جدید تحقیقات کی رو سے جو نکات نکھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں :

---

[19] الفوز الکبیر : ۲۳

۱۔ تورات کو اول اول جس سماوی زبان میں لکھا گیا اس میں ایک ہی لفظ کو دو مختلف معانی پہنائے جا سکتے ہیں۔

۲۔ تاریخ سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ خروج سے پہلے ان کے صحائف کون کون تھے اور ان کے مضامین کی کیا نوعیت تھی۔

۳۔ بخت نصر کے ہاتھوں جو فلسطین کی تباہی ہوئی اس میں تورات کے تمام نسخوں کو بھی تباہ کر دیا گیا تھا۔

۴۔ عزرا اور نحمیا نے محض اپنے حافظہ اور سنی سنائی روایات کے بل پر تورات کے نسخوں کو ترتیب دیا۔

۵۔ عہد بعہد اس کے بعض صحیفوں جیسے مزامیر سلیمان وغیرہ میں اضافے بھی ہوئے ہیں۔ اور ان اضافوں کی جھلک ان صحیفوں میں صاف نظر آتی ہے۔

۶۔ ان میں تاریخی اور نظریاتی تضادات کی اچھی خاصی کثرت ہے۔

۷۔ یہ تمام صحائف قریب قریب تراجم کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ اور وہ اصل عبرانی یا آرامی نسخے کہیں پائے نہیں جاتے جن میں ان کا نزول ہوا تھا۔

قرآن حکیم نے واضح لفظوں میں یہودیوں کی تحریف کا ذکر کیا ہے:

من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعہ[۲۰]

یہودیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ کلمات کو ان کے اصل مقامات سے بدل دیتے ہیں۔

یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظا مما ذکروا بہ[۲۱]۔

یہ لوگ کلمات کو اپنے اصل مقامات سے بدل دیتے ہیں۔ بعض باتوں کی ان کو نصیحت کی گئی تھی اس کا بھی ایک حصہ فراموش کر لیتے۔

ثم یحرفونہ من بعد ما عقلوہ[۲۲]

پھر اس کو سننے اور جاننے کے بعد بھی بدل دیتے ہیں۔

---

[۲۰] النساء: ۴۶ [۲۱] المائدہ: ۱۳ [۲۲] البقرہ: ۷۵

صحابہ یہودیوں کی اس عادت سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ حضرت حسان کا کہنا ہے:

ھم اوتوا الکتاب فضیعوہ وھم عمی عن التوراۃ بور

کتمانِ حق

تحریف کے علاوہ قرآن حکیم نے یہودیوں سے اس بات پر بھی اعتراض کیا ہے کہ یہ اکثر ازراہِ تعصب حق کو چھپاتے ہیں اور یہ نہیں چاہتے کہ تورات میں جو آنحضرتؐ کے متعلق پیشگوئیاں مذکور ہیں اور جن کو وہ اچھی طرح جانتے بوجھتے تھے ان کا انکشاف ہو پائے۔

یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم [۲۳]

اور یہ آنحضرتؐ کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح یہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں [۲۴]

یا قرآنی تعلیمات اور توراۃ کے احکام میں جو توافق پایا جاتا ہے اس کا اظہار بھی ہو۔ یہ اپنے لگے بندوں سے صاف صاف کہتے کہ مسلمانوں کو ایسی باتیں کیوں بتاتے ہو جن سے ان کی تائید کا پہلو نکلتا ہے۔

قالوا اتحدثونھم بما فتح اللہ علیکم [۲۴]

اور کہتے کیا تم مسلمانوں کو ایسی باتیں بھی بتا دیتے ہو جن کو اللہ تعالیٰ نے تم پر ظاہر فرمایا۔

یہ تعصب کی وہ حد ہے جہاں پہنچ کر کوئی بھی معاشرہ مذہبی و دینی اقدار کے بارہ میں اخلاص نہیں برت سکتا۔ یہی وجہ ہے یہودی فقیہ اور فریسی کبھی بھی صحیح معنوں میں تورات پر عمل پیرا نہیں رہے بلکہ ہمیشہ انھوں نے کوشش کی تورات کے احکام کو کسی نہ کسی طرح تاویل و تعبیر کے بل پر ٹال دیں۔ اور صرف اس حد تک ان کو زندگی کا جزو بنائیں جس حد تک رسوم و شعائر کی تکمیل ہوتی ہے یا جس حد تک ان کے قومی پندار و غرور کی تسکین ہوتی ہے یا یوں کہیئے کہ جب تک یہ احکام ان کی دنیوی زندگی کے تقاضوں سے کھلم کھلا متصادم نہیں ہوتے۔

---

[۲۳] البقرہ : ۱۴۶

[۲۴] بائبل میں آنحضرتؐ کے بارہ میں کیا پیش گوئیاں ہیں۔ اور کس درجہ صاف اور واضح ہیں ان کے مبارک عہد کا تذکرہ ہے۔ اس کے لیے دیکھیے۔ (بشریٰ) مصنفہ مولانا عنایت رسول صاحب چڑیا کوٹی۔ مطبوعہ شیروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ۔

ریاکاری اور منافقت کی یہی وہ صورت حال تھی جس پر بار بار حضرت مسیح نے انھیں ٹوکا اور قرآن نے متنبہ کیا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قرآن نے مخاصمہ یا گرفت کے شوق میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور یہودیوں کے معاملہ میں ناانصافی کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ اس نے حقیقت کا اعتراف بھی کیا کہ اکثریت کے نفاق کے باوجود ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو حد درجہ پاک باز اور خدا دوست تھے۔ قرآن کے آداب مخاصمہ یا مناظرہ کا ایک زریں اصول یہ ہے کہ کسی بھی حالت میں عدل و انصاف کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے:

ولا یجرمنکم شنان قوم ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی[۲۵]

اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے

اور کیسے لفظوں میں دشمنوں کی خوبیوں کا اعتراف کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں یہودیوں کے دینی انحطاط کا تذکرہ کیا کھل کر یہ بھی کہا:

لیسوا سواء من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون ایٰت اللہ اٰناء الیل وھم یسجدون[۲۶]

یہودی سب ایک جیسے نہیں ان میں کچھ لوگ خدا کے حکموں پر قائم بھی ہیں جو رات کو اٹھ اٹھ کر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور اللہ کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔

اور یہی وہ خدا دوست لوگ تھے جنھیں یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ اسلام کی سعادت سے بہرہ مند ہوں اور اس بات کی عملی شہادت پیش کریں کہ بائبل میں اسلام اور آنحضرتؐ کے بارہ میں جو کچھ کہا گیا وہ برحق تھا۔

الفاظ پرستی یا حرفیت پسندی میں غلو

جس شے نے یہودی معاشرہ کو تکمیل و ارتقا کے طبعی تقاضوں سے باز رکھا اور ان کے قانون و فقہ کو جامد، ٹھس اور عمل کے لحاظ سے دشوار تر بنا کر رکھ دیا، وہ ان کی الفاظ پرستی اور حد سے بڑھی

---

[۲۵] المائدہ : ۸ [۲۶] آل عمران : ۱۱۳

ہوئی حرفیت پسندی تھی اور فکر و ذہن کی یہ آخری کجی تھی جس نے یہودی نظامِ حیات کو تعصب اور تنگ نظری کے زندانِ تاریک میں ڈال دیا اور ان کے جذبہ غرور و ریاکاری کو ہوا دی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک فقہ و تشریع کا تعلق ہے اس کا اصل سرچشمہ صحائف ربانی اور دینی متون ہی ہو سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ استنباط و تشریح اور تخریج مسائل میں پیرایہ بیان یا الفاظ و حروف کے ٹھیک ٹھیک اطلاقات کو بہت دخل ہے۔ لیکن الفاظ، نصوص اور متون کے علاوہ کچھ ایسے ہمہ گیر اور انسانی فطرت اور عدل و انصاف پر مبنی وسیع تر پیمانوں اور اصولوں کا ہونا بھی ضروری ہے جو متون، الفاظ اور تصریحات سے مستنبط ہونے کے باوجود اس لائق ہوں کہ مسائل کو ایک متوازن سانچے میں ڈھال سکیں اور ان کو ایک نظام میں منسلک کرنے کے ساتھ ساتھ ایسی شکل بھی عطا کر سکیں کہ فرداً فرداً انسانی فطرت اور دین ان کو آسانی سے تسلیم کر سکے۔

فقہ و قانون کی تشکیل و ساخت کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اسی سے کسی قوم یا معاشرہ کا مزاج بنتا یا بگڑتا ہے۔ اگر قانون سہل، معقول اور ارتقا پذیر ہے اور اس میں ہر ہر دور کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو سمونے کی صلاحیت موجود ہے تو قوم نہ صرف آگے بڑھتی اور ترقی کرتی ہے بلکہ تہذیبی اور روحانی خوبیوں کے لحاظ سے بھی اپنی معاصر قوموں میں ایک ممتاز مقام حاصل کر کے رہتی ہے۔ اور اگر قانون بے جان اور انسانی قدروں سے ناآشنا اور بے روح ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو قوم بھی اس کو اپنائے گی۔ یہی عیب اس کی زندگی میں منعکس کے رہیں گے۔

مزید براں اس نوع کا فقہی نظام جو بالاتر انسانی بنیادوں پر استوار نہ ہو اور جس کے پیچھے کوئی حکمت فلسفہ یا روح کارفرما نہ ہو اور جو محض الفاظ و حروف کی موشگافیوں اور تفریع در تفریع قیاس آرائیوں میں محصور ہو کر رہ جائے۔ آخر آخر میں ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے جس پر عمل کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں یہ نظام اصلاح کی بجائے قوم کے لیے مضر ثابت ہوتا ہے اور ارتقا کی راہ میں پاؤں کی زنجیر اور گلے کا طوق بن جاتا ہے۔

فقہ و قانون کی ساخت اور مزاج کے معاملہ میں یہی وہ صورت حال تھی جس میں یہودی گرفتار تھے اور یہی وہ صورت حال تھی جس کا قرآن حکیم نے یہ کہہ کر تدارک کیا۔

ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم [۲۷]

اور آنحضرت سے بوجھ طوق کو جو انھوں نے ان پر زیب گلو کر رکھے تھے، اتار پھینکے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم نے تشریع و فقہ کے بارہ میں یہودیوں سے صرف مخاصمہ ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے مقابلہ میں فقہ و تقنین سے متعلق اس اہم اور مثبت نکتہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ فقہ و قانون کو بہرحال آسان، قابل عمل اور ارتقا کے عملیہ میں ممد و معاون ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ اس کی گرانباریوں کا کوئی معاشرہ متحمل ہی نہ ہو سکے۔

یہودی دراصل اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ قانون جس قدر سخت، مفصل اور ایک ایک جزئیہ پر مشتمل ہوگا اسی قدر موقر اور مفید ہوگا۔ لیکن انھیں فطرت انسانی کا یہ راز معلوم نہ تھا کہ قانون کی سختی اکثر قلب و روح کی شگفتگی کو پامال کر دیتی ہے اور اس کی جزئیات اور پھیلاؤ فقہ و قانون کے اس لوچ اور پذیرائی کی صلاحیت و استعداد کو ختم کر دیتا ہے جس کی بدولت ہر ہر دور کی سچائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر آگے بڑھ سکتا ہے اور تہذیب و ثقافت کو وقت و عصر کی تنگنائیوں سے نکال کر وسیع تر دنیا کی دولت سے مالا مال کر سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[۲۷] الاعراف: ۱۵۷

اسلام --- دینِ آسان

از۔ مولانا محمد جعفر پھلواروی

جو لوگ اسلام کے احکام کو بہت دشوار اور ناممکن العمل سمجھتے ہیں، انھیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کو ہماری تنگ نظری اور غلط فہمیوں نے دشوار بنا دیا ہے۔ ورنہ حضور اکرمؐ کے فرمان کے مطابق دین آسان ہے۔ اس کتاب میں ایسے متعدد مسائل پر تفصیل سے عقلی روشنی ڈالی گئی ہے جو بہت الجھے ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔

صفحات: ۳۶۸ قیمت: ۳/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور